پاکستان اور امریکی دستور

(نعیم صدیقی)

(۴)

عدلیہ انتظامیہ کے بالمقابل عدلیہ جہاں مقننہ کو دستوری حدود پھاندنے سے روکتی ہے وہاں وہ صدر اور انتظامیہ پر بھی قابو رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ۲ جون ۱۹۵۲ء کو پہلا موقع پیدا ہوا جبکہ سپریم کورٹ نے اپنی تاریخ میں صدر کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ اس نے اپنے دستوری اختیارات کی حد سے تجاوز کیا ہے۔ پریذیڈنٹ ٹرومین نے اپنے سیکرٹری آف کامرس کو اس امر کا مجاز ٹھیرایا کہ وہ ملک کے فولادی کارخانوں کو تصرف میں لے کر ان کا انتظام چلائے۔ یہ اقدام جنگ کوریا کے دوران میں فولادی کارخانوں کے اندر مزدوروں کے ایک تنازعہ سے پیدا ہو جانے والی گڑبڑ کے سدباب کے لیے کیا گیا تھا۔ عدالت نے صدر کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

"اس قوم کے بانیوں نے قانون سازی کا سارا اختیار بھلے اور برے وقتوں کے لیے تنہا کانگریس کو تفویض کیا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ ان تاریخی واقعات ــــ طاقت کے خوف اور آزادی کے حوصلوں ــــ کا تذکرہ کیا جائے جو ان کی پسند کے پس منظر میں موجود تھے۔ البتہ اس طرح کا تبصرہ ہمارے فیصلہ کی تصدیق کرے گا کہ (SEIZURE ORDER) "قائم نہیں رہ سکتا۔"

واضح رہے کہ اس فیصلہ کو صادر کرنے والے تمام جج اسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جس کی طرف سے صدر کو لایا گیا تھا اور خود ان ججوں کا تقرر اسی پارٹی کے صدر نے کیا تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ پہلے بھی سول وار کے زمانے میں صدر لنکن نے ہیبیس کارپس کے حق کو جنگی صورت حالات کی بنا پر معطل کر دیا تو معاملہ عدالت کے سامنے آیا۔ برطانیہ کی دستوری روایت کے مطابق امریکہ میں بھی یہ اقدام صرف کانگریس کی منظوری سے کیا جا سکتا تھا، صدر اپنے اختیار سے اس حق کو معطل کرنے کا مجاز نہ تھا۔

چنانچہ قبل اس کے کہ عدالت فیصلہ دیتی، کانگریس نے صدر کو قانونی اختیار تفویض کر دیا۔

اب آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ وسیع شہری حقوق کے تحفظ میں مقننہ اور انتظامیہ کے بالمقابل امریکی عدلیہ کیا پارٹ سر انجام دیتی ہے۔ بقول لارڈ برائس "سپریم کورٹ دستور کی زندہ آواز ہے"!

صدر کا مقام اب آیئے براہ راست امریکی صدر کے مقام کا مطالعہ کریں۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ بہ حیثیت مجموعی انتظامیہ (EXECUTIVE) کی دستوری حیثیت کا جائزہ لیا جائے۔

دنیا کی ہر دستوری ریاست میں انتظامیہ کے اختیارات پر تحدیدات عائد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انتظامیہ ہمیشہ اور لازماً کسی نہ کسی کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ اگر وہ براہِ راست پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہو تو اسے پارلیمانی انتظامیہ (PARLIAMEINTARY EXECUTIVE) کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی وسیع تر دائرہ میں خاص خاص متعین وقفوں پر جوابدہ ٹھہرتی ہو اور اسے پارلیمانی طریقے سے برطرف نہ کیا جا سکے تو اسے غیر پارلیمانی یا منصوب انتظامیہ (FIXED EXEGUTIVE) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

امریکہ میں بھی منصوب انتظامیہ کام کرتی ہے۔ یہ صدر اور اس کے وزراء پر مشتمل ہے۔ لیکن وزرا کانگریس کے تابع نہیں ہیں اور وہ نہ تو ایوان نمائندگان میں اور نہ سینیٹ میں خطاب کرنے یا ووٹ دینے کے مجاز ہیں۔ مقننہ اور انتظامیہ کا باہمی رابطہ تمام تر صدر کے پیغام کے ذریعے قائم ہوتا ہے جو سال میں ایک بار بھیجا جاتا ہے یا اگر خصوصی حالات میں ضرورت ہو تو وہ ایک خصوصی اجلاس طلب کر کے خطاب کر سکتا ہے۔

اختیارات صدر کے مؤثر اختیارات یہ ہیں:-

۱- وہ ہر سال تحریری یا تقریری پیغام کے ذریعے کانگریس کو ان مسائل اور مصلحتوں سے آگاہ کرتا ہے جن کے مطابق پالیسی کو آگے لے چلنا ہوتا ہے اور جن کے مطابق قانون سازی کے میدان میں بہت سے فیصلے مطلوب ہوتے ہیں۔

۲- وہ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف ہوتا ہے اور تعلقات خارجہ کے میدان میں سلسلہ جنبانی کا کامل اختیار اسی کو حاصل ہے۔ وہ بغیر کانگریس سے مشورہ لیے کسی غیر ملکی سرزمین پر فوجی دستے روانہ کر سکتا ہے اور بحری یا فضائی فوجوں کو دنیا کے کسی گوشے کی طرف متحرک کر سکتا ہے۔ وہ کسی بھی حکومت کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر سکتا

ہے اور کسی بھی حکومت سے تعلقات توڑ سکتا ہے۔

۳۔ سینیٹ کے مشورے اور منظوری سے معاہدات کے لیے گفت و شنید کرتا ہے، سفیروں اور ڈپلومیٹک عہدہ داروں اور مشیروں کی تقرری کرتا ہے، اپنی مجلسِ وزرا اور انتظامی نائبین کی تقرری عمل میں لاتا ہے اور انتظامی اور عدالتی دائرے میں بے شمار فیڈرل عہدہ داروں کو مامور کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

۴۔ وہ ممالکِ غیر میں خصوصی وفود روانہ کرنے کے لیے سفارتی مرتبے کے ذاتی نمائندے مقرر کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ ان کے ناموں کو سینیٹ کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرے جیسا کہ مستقل تقرریوں کی صورت میں معمول ہے۔

۵۔ وہ غیر معمولی صورتوں میں کانگریس یا اس کے کسی ایوان کا خصوصی اجلاس طلب کر سکتا ہے اور ان کے اجلاس کسی مناسب مدت کے لیے ملتوی کر سکتا ہے۔

۶۔ صرف صدر ہی کا یہ اختیار ہے کہ غیر ممالک کے سفیروں اور نمائندوں کو شرفِ باریابی دے۔

۷۔ یہ منصب بھی تنہا اسی کا ہے کہ وہ عدالتی سزاؤں کو منسوخ کرے اور مجرمین کو معافی دے۔

۸۔ صدر ہی کی ذمہ داری ہے کہ ریاستہائے متحدہ کے قوانین کو نافذالعمل رکھے۔

۹۔ وہی قومی حکومت کے تمام افسروں کو کمیشن دیتا ہے۔

۱۰۔ دستور کے کسی مصرحہ اختیار کے نہ دینے کے باوجود معمول یہ ہے کہ صدر کسی سرکاری عہدہ دار کو برطرف کر سکتا ہے۔

۱۱۔ انتظامیہ کا بجٹ صدر کے دفتر میں مرتب ہوتا ہے اور یہی بجٹ کانگریس کے لیے سال بھر کے مالیات کے طے کرنے میں رہنما بنتا ہے۔

۱۲۔ معمول کے ان اختیارات کے علاوہ زمانۂ جنگ میں حسبِ روایت کانگریس کی طرف سے صدر کو وسیع عمومی اختیارات تفویض کیے جاتے ہیں۔

۱۳۔ وہ کانگریس کے پاس کردہ قوانین کو اپنے ویٹو کے ذریعے مسترد کر سکتا ہے۔

اختیارات کی اس وسعت کی اصل بنیاد یہ ہے کہ صدر براہِ راست عوام کا منتخب کردہ ہے اور ایک

محدود مدت کے لیے برسر اقتدار آتا ہے۔ براہ راست عوامی نمائندہ ہونے کی پوزیشن خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صدر ایک موثر طاقت ہو۔ ورنہ اگر ایک بے جان پرزہ ہی مطلوب ہوتا تو پھر یہ کافی تھا کہ پارلیمنٹ (کانگریس) اسے نامزد کر دیا کرتی۔[1]

کانگریس بہ مقابلہ صدر صدر کے اتنے وسیع اختیارات دیکھتے ہی ہر حکمران کا جی للچاتا ہے، اور واقعہ بھی ہے کہ یہ بہت ہی وسیع اختیارات ہیں جو دنیا کے ایک انتظامی حاکم کو حاصل ہیں۔ شاہ برطانیہ کے پاس ان کا سواں حصہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ان وسیع اختیارات کے ساتھ صدر امریکہ کو کوئی ایسا کھلا میدان نہیں دے دیا گیا جس میں کسی طرف بڑھتے چلے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ایک بڑی رکاوٹ مضبوط اور آزاد عدلیہ کی صورت میں سامنے ہے۔ دوسری بڑی رکاوٹ مقننہ ہے جو اپنے دائرے میں بالکل آخری اختیارات رکھتی ہے۔

کانگریس کے قبضے میں دو جوابی اختیارات ہیں۔

ایک یہ کہ قومی خزانہ اس کے زیر تصرف ہے،

دوسرے یہ کہ قانون سازی کے دائرے میں وہی آخری اختیار کی حامل ہے۔

اب اگر صدر کوئی ایسا اقدام کرتا ہے جو رائے عام کی تائید سے محروم ہے تو عوام کی حمایت کی بنیاد پر کانگریس اس اقدام کو روکنے اور ناکام بنانے کے لیے جو جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے:۔

۱۔ صدر اپنے پروگرام کو چلانے کے لیے ضروری قوانین کے پاس کرنے کا جو مطالبہ کانگریس سے کرے وہ اسے مسترد کر سکتی ہے۔ وہ مطلوبہ اختیار اور مالیات کی فراہمی نہ کر کے اسے ناکام بنا سکتی ہے۔

۲۔ وہ ایسے قوانین پاس کر سکتی ہے جو صدر کے منشا کے خلاف، اور اس کے پروگرام کے لیے مضر ہوں؛ یہاں تک کہ وہ صدر کے ویٹو کو بھی مسترد کر کے آگے بڑھ سکتی ہے۔

۳۔ وہ انتظامی اداروں اور سرگرمیوں کے لیے ضروری فنڈز کی فراہمی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے، چاہے

---

[1] یہ اختیار کسی آزاد ملک کے انتظامی حکمران کے لیے انسانی حاشیۂ خیال میں نہیں آ سکتے جس کا تقرر چند افراد کی سازباز سے ہو اور جس کے تقرر کی منظوری ملکہ برطانیہ کے دربار سے حاصل ہوتی ہو۔

ان اداروں اور سرگرمیوں کو باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہو۔

۴۔ وہ مباحثۂ عام کے ذریعے تعین کر سکتی ہے کہ صدر کے بعض پروگراموں اور پالیسیوں پر کانگریس کی طرف سے قانونی منظوری نہ دی جائے گی۔

۵۔ وہ تجاویز پاس کر کے پالیسی کے متعلق ایسے اعلانات کر سکتی ہے جو صدر کو کانگریس کے تعاون سے محرومی کا انتباہ دیں۔

۶۔ سینیٹ اپنے خاص اختیارات کے ساتھ خارجہ معاملات میں صدر کی مزاحمت کر سکتی ہے۔ وہ صدر کے طے کردہ معاہدات کو کالعدم ٹھہرا سکتی ہے یا ایسی شرائط ان میں شامل کر سکتی ہے جو فریق ثانی کے لیے ناقابلِ قبول ہوں۔ اسی طرح وہ کلیدی مناصب کے لیے صدر کے نامزد کردہ عہدہ داروں کی تقرری کو منظور کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔

۷۔ کانگریس معاملات کی تحقیقات کے اختیار سے کام لے کر کسی انتظامی عمل و اقدام کا جائزہ لے سکتی ہے اور اس کے اندر ہونے والی بے ضابطگیوں کی بنا پر انتظامی مامورین کو برطرف کرنے پر مجبور کر سکتی ہے جہاں مجرمانہ اقدامات کیے گئے ہوں وہاں مجرمین کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے علاوہ پالیسی کی تبدیلی کی محرک بن سکتی ہے۔

۸۔ فی الجملہ کانگریس ہی وہ طاقت ہے جو اعلانِ جنگ کر سکتی ہے، جو ٹیکس عائد کر سکتی ہے، جو تجارت کا انضباط کر سکتی ہے، قومی قرضوں کا انتظام کرتی ہے، روپیہ فراہم کرتی ہے اور اس کے مصارف کی منظوری دیتی ہے۔ فوجی دستوں کو قائم کرتی اور ان کو سنبھالتی ہے۔

۹۔ آخری چیز یہ کہ حکومت کے تمام شعبوں کے افسرانِ اعلیٰ ـــ حتیٰ کہ صدارت تک کا محاسبہ (IMPEACHMENT) کرنے کا اختیار صرف ایک کانگریس کو حاصل ہے۔

اعلیٰ انتظامی حکمراں ـــ صدر ـــ کے وسیع اختیارات کے بالمقابل جب مقننہ کے یہ اختیارات رکھے جاتے ہیں تو کسی نہ کسی حد تک وہ توازن و اعتدال قائم ہو جاتا ہے جسے دستور سازوں نے پیشِ نظر رکھا تھا۔

صدر کا ویٹو | صدر اور کانگریس کے درمیان جب قانون سازی کے معاملات میں اختلاف ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں کانگریس اگر کوئی قانون پاس کر دے تو صدر اس کا راستہ ویٹو سے روک سکتا ہے۔ اگر کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہو تو اس کے پاس کردہ کسی قانون پر منظوری کے دستخط ثبت نہ کرتے ہوئے اگر دس روز کے اندر اندر صدر اپنی عدم منظوری

کانوٹ ایوان کو سپرد کردے تو وہ قانون مسترد ہو جاتا ہے، لیکن اگر دس روز کے عرصے میں وہ اپنا انکاری پیغام نہ پہنچا سکے تو اس کے دستخط نہ کرنے کے باوجود قانون قانون بن جاتا ہے اور نافذ ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کانگریس ایک قانون کو پاس کرنے کے بعد (دس روز کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی) اپنا اجلاس ملتوی کر دے اس صورت میں صدر اگر منظوری نہ دے تو دس روز کے اندر نوٹ کی ترسیل کی شرط پوری کیے بغیر اس کا ویٹو کام کرے گا اور قانون ناقابل نفاذ رہے گا۔ اس دوسری صورت میں صدر کا اختیار "پاکٹ ویٹو" کہلاتا ہے۔

لیکن اگر کانگریس عوامی حمایت رکھتی ہو تو دو تہائی اکثریت کے ساتھ وہ دوبارہ اس قانون کو پاس کر کے صدر کے ویٹو کو غیر مؤثر بنا سکتی ہے۔ اس صورت میں صدر کے دستخط کی ضرورت نہیں رہتی۔

اصل مزاحم طاقت صدر اور کانگریس کے درمیان اختلاف اور کشمکش ہونے کی صورت میں کسی بھی امر متنازعہ فیہ میں وہ فریق دوسرے کو پچھاڑتا ہے جو رائے عام کی حمایت ساتھ رکھتا ہو۔ صدر اگر کانگریس کے مقابلے پر آئیگا تو صرف اسی صورت میں آئے گا جبکہ اسے یہ اطمینان ہو کہ پبلک کی تائید اس کے ساتھ ہے۔ اسی طرح کانگریس اگر صدر کی مزاحمت کرنے کی جرأت کرسکتی ہے تو اس حالت میں جبکہ اسے اندازہ ہو کہ عوام کسی معاملے میں صدر کے خلاف ہیں اور اس کی پشت پر! پس اس دستوری ترازو کی ڈنڈی رائے عام کے تصرف میں ہے۔

رائے عام پارٹیوں کے گرد منظم ہے جن میں قابل ذکر طاقت دو ہی پارٹیوں کی ہے: ایک ڈیموکریٹک پارٹی، دوسری ری پبلکن پارٹی! بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ جو پارٹی مقبول عوام ہوتی ہے وہ کانگریس میں اکثریت حاصل کرتی ہے اور اسی کا کوئی نمائندہ صدارت پر آتا ہے۔ لیکن صدارت اور کانگریس کے ایوانوں کے انتخاب کو بلحاظ مدت اور طریق کار الگ الگ رکھ کر اور بیکدم سینیٹ کے ایک تہائی ممبروں کو منتخب کرنے کا طریقہ اختیار کر کے اس کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ ایک وقت میں اکثریت ایک پارٹی کی ہو اور صدر دوسری پارٹی کا ہو! پس صدر اور کانگریس کے باہمی طرز عمل کا انحصار پارٹی پوزیشن پر ہوتا ہے۔

چونکہ پارٹیوں کو تھوڑی ہی مدت بعد الیکشن کے لیے پبلک کے سامنے جانا ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے نمائندوں ——— کانگریس کے ارکان اور صدر اور نائب صدر ——— کو لازماً ایسے پروگرام اور ایسی پالیسی پر کاربند رکھتی ہیں جو پبلک کا اعتماد حاصل کرسکے۔ ورنہ ان کو اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ طاقت حریف کے قبضے میں چلی جائے گی۔

ایک اور مزاحمت | صدر کو امریکی دستور نے جہاں اتنے اختیارات دیئے ہیں کہ ایک شخص ان کے استعمال میں خیانت کر کے اپنی ذات کو خدائی کے مقام تک پہنچا سکتا ہے اور قومی مفاد اور عوامی حقوق کے پرخچے اڑا سکتا ہے، وہ ملک کی سلامتی کو غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھ بیچ کر اپنا دامن بھر سکتا ہے۔ دستور نے اس امکانی خیانت کا راستہ بند کرنے کے لیے محاسبہ (IMPEACHMENT) کا اختیار کانگریس کو دیا ہے۔ صدر سے اگر کوئی غیر دیانت دارانہ فعل سرزد ہو جائے، اگر وہ ذمہ داریوں کی بجا آوری میں بدنیتی سے کوئی خلل آنے دے، اگر وہ اپنے حلف اور دستور اور قانون کے خلاف دیدہ و دانستہ کوئی ساز باز کرے، اگر وہ ذاتی مفاد کے لیے کوئی ناجائز تصرف کرے تو جب ایوان کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوگا اور صدارت کے منصب سے علیحدگی کے علاوہ نااہلیت (DISQUALIFICATION) کا وبال اس پر ڈالا جا سکتا ہے۔ نیز وہ اگر بروئے قانون کسی دوسری سزا کا مستوجب ہو تو وہ الگ سے عائد ہو سکتی ہے۔

ان سارے اجزائے گفتگو کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکی دستور کا نقشہ اور اس کی ساخت کیا ہے اور اس میں تقسیم اختیارات اور مزاحمات و توازنات کا اہتمام کس طرح کیا گیا ہے۔ ہم نے اس اصل موضوع سے ہٹ کر یہ کوشش نہیں کی ہے کہ امریکی دستور کی کمزوریوں اور اس کے اندر سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو زیر بحث لائیں یا اسلامی نظریۂ دستور کی روشنی میں اس پر تنقید کریں۔

پاکستان کے لیے ناقابلِ عمل | آخر میں ہمیں ایک اور پہلو کو واضح کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پاکستان امریکی دستور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ امریکی دستور میں "نمائندگی عوام" ایک مرکزی اصول ہے۔ اس اصول کے تقاضے سے کانگریس کے ارکین اور صدر اور ذیلی ریاستوں کی مجالس کے لیے انتخابات ناگزیر ہیں۔ ان انتخابات کی بڑی کثرت ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ ایوان نمائندگان کے لیے ہر دو سال بعد ملک گیر انتخابات۔

۲۔ سینیٹ کے لیے ہر دو سال بعد ایک تہائی تعداد ارکان کے لیے انتخابات۔

۳۔ صدر و نائب صدر کے انتخاب کے لیے ہر چار سال بعد انتخاب کنندگان (ELECTORS) کا انتخاب یعنی ہر چار برس کی مدت میں تین بار شہریوں کو انتخابات میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ وفاقی ریاستوں

کے داخلی انتخابات کو بھی اگر شامل کیا جائے تو کم سے کم ایک انتخاب سالانہ کا حساب پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہمہ وقت پوری مشینری کو بر سر عمل رہنا چاہیے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ہر سالانہ بجٹ میں بہت کثیر مصارف کی گنجائش رکھنا ضروری ہے۔ پاکستان جیسا غریب ملک اتنا بار اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اگر امریکی دستور کے انتخابی پہلو کو کمزور کر دیا جائے تو پھر نظام حکومت کے اندر سخت درجہ کے مفاسد پیدا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا انتخابی پہلو نہایت ضروری ہے۔

دوسرا نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں امریکی دستور کے صحیح طور پر کام کرنے اور مختلف اختیارات کے اپنی اپنی حدود میں رہنے اور ان کے درمیان توازن کے قائم رہنے کا دارومدار رائے عام پر ہے۔ عوام جب تک سیاسی و تمدنی امور کے سمجھنے والے، روزمرہ کی حکومتی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے، تمام اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینے والے نہ ہوں، کسی ملک میں امریکی دستور کا تجربہ کرنا ایک خطرناک کھیل کھیلنا ہے۔ اس کے ذریعے اگر تین شعبوں کو بڑے بڑے مستقل اختیارات دے دیئے جائیں اور پھر ان کو متوازن رکھنے میں رائے عام اپنا فرض ادا نہ کر سکے تو یہ اختیارات قدم قدم پر باہم دگر ٹکرائیں گے اور ہر شعبہ یہ چاہے گا کہ وہ دوسرں کو ہڑپ کر کے خود ہی سب کچھ بن جائے۔ عوام کی صرف بیداری بھی کافی نہیں۔ ضرورت اس کی بھی ہے کہ دستور و قانون کے احترام اور نظم کی پابندی اور حدود کی پاسداری کی مستقل قومی روایات موجود ہوں جو کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کی حفاظت کر سکیں۔ جہاں یہ سب کچھ نہ ہو وہاں محض انتظامی حکمراں کا امریکی صدر جیسے اختیارات سے مسلح ہو جانا ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے ــــ اور وہ ہے چنگیزی ڈکٹیٹر شپ! اور ڈکٹیٹر شپ وہ ملعون برائی ہے کہ جس کے مقابلے میں دوسری ساری خرابیاں گوارا کی جا سکتی ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بھی سامنے رہے کہ امریکی دستور اپنی ساخت میں بہت پیچیدہ ہے اور اس پر کام کرنے والی مشینری بھی سادہ وضع کی نہیں ہے۔ اس قسم کے دساتیر پر حکومت کی مشینری کو صحت کے ساتھ چلائے جانے کے لیے باشعور عوام کے علاوہ نہایت درجہ بیدار مغز حکمرانوں اور عہدہ داروں اور کارکنوں کی ضرورت ہے۔ ہمارا احساس یہ ہے کہ برطانوی طرز کے سادہ دستوری ڈھانچے پر کام کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس معیاری افراد کی کافی تعداد موجود نہیں ہے، کجا کہ امریکی ساخت کے پیچیدہ دستوری ڈھانچے کو لا نصب کیا جائے!

(باقی ص ۲۸۲ پر)

بقیہ امریکی دستور

ان دقتوں کا کوئی حل نہ ہے، نہ امریکی دستور پر فریفتگی کا اظہار کرنے والوں نے اس طرح کے مسائل کو کبھی سوچا ہو گا۔ ان کی تو نگاہیں غیر محدود اختیارات پر ٹھپ کر رہ گئی ہونگی۔ ہاں! اگر ان کا حل نکل آئے تو اسلامی اصول اسی طرح اس ڈھانچے میں کام کر سکتے ہیں جس طرح وہ کسی دوسرے ڈھانچے میں کر سکتے ہیں۔